مولانا حمید الدین فراہی

حیات و خدمات

ابو اللیث اصلاحی ندویؒ
ترجمہ: محمد راشد اصلاحی

(مولانا ابو اللیث اصلاحی ندویؒ (۱۹۱۳۔۱۹۹۰ء) نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں قیام کے دوران مولانا حمید الدین فراہیؒ کی حیات و افکار پر عربی مجلہ الضیاء (۲/۴ نومبر ۱۹۳۳ء) میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ یہ مضمون مولانا کے انتقال کے ٹھیک تین سال بعد لکھا گیا اور اس میں مولانا کی شخصیت اور ان کی علمی خدمات کا بڑے دلنشین انداز میں تعارف کرایا گیا ہے اس مضمون کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مولانا فراہی کی شخصیت اور انکے علمی مقام و مرتبہ کے بارے میں علامہ تقی الدین ہلالی کے خیالات و تاثرات کو انہیں کے الفاظ میں نقل کیا گیا ہے جو ان کی ذاتی ڈائری سے ماخوذ ہیں اس مضمون کی اہمیت کے پیش نظر اس کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ ادارہ)

علامہ حمید الدین فراہی ان یگانہ روزگار شخصیات میں شامل تھے جو صدیوں میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ آپ ۱۸۶۴ء میں ماہ جمادی الثانیہ میں اعظم گڑھ کے ایک گاؤں "پھریہا" میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے تھا۔ آپ کے والدین بھی نہایت شریف النفس تھے اور انھیں کے زیر سایہ آپ پروان چڑھے۔ دس سال ہی کے تھے تو قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اور اس کے بعد اس وقت کے دستور کے مطابق فارسی زبان و ادب کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے اور اس فن کے جانے مانے استاد مہدی حسن صاحب (چتارہ، اعظم گڑھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور صرف چھ ماہ کی قلیل مدت میں انھوں نے اس میدان میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ فارسی میں شاعری کرنے لگے اور جولانیٔ طبع کا عالم یہ تھا کہ بہت سے مشہور شعراء کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ چنانچہ سولہ سال کی عمر میں انھوں نے فارسی کے عظیم شاعر خاقانی کے طرز پر ایک قصیدہ لکھا جس کا معیار زبان و بیان اور فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے نہایت بلند تھا۔ ماہرین زبان و ادب نے اسے بہت پسند کیا۔ علامہ شبلی نے اس قصیدہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اسے فارسی اور عربی کے مشہور ادیب مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی کے پاس لے گئے اور انھیں سنانے کے بعد پوچھا کہ یہ کس کا قصیدہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں یہ تو نہیں جانتا کہ یہ قصیدہ کس کا ہے البتہ مجھے متقدمین شعراء میں سے کسی کا

معلوم ہوتا ہے۔ آپ کا فارسی میں ایک دیوان بھی ہے جو آپ کے بھائی حاجی رشید الدین فراہیؒ، ناظم مدرسۃ الاصلاح کی زیرِ نگرانی بڑے اہتمام سے منظرِ عام پر آیا ہے[۱]۔ فارسی زبان کی تکمیل کے بعد انھوں نے عربی زبان وادب کی طرف توجہ کی اور اس وقت ان کی عمر ۱۴ سال تھی۔ درسِ نظامی کی متوسط کتابیں انہوں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی علامہ شبلی نعمانی سے پڑھیں جو عمر میں آپ سے چھ سال بڑے تھے۔ پھر کچھ دنوں لکھنؤ میں مشہور فقیہہ مولانا ابوالحسنات عبدالحیؒ کے پاس رہ کر ان سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد تشنگیٔ علم انھیں مشہور و معروف ادیب مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے پاس لے گئی جو عربی زبان وادب پر غیر معمولی دسترس کے لیے مشہور تھے اور مختلف مقامات سے طلبہ حصولِ علم کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ چنانچہ مولانا فراہی نے کچھ دنوں ان سے استفادہ کیا اور اپنے علم کی پیاس بجھائی۔ اِنھیں علمی صحبتوں کا نتیجہ تھا کہ وہ علوم وفنون کی دنیا میں ایسے بلند مقام پر فائز ہو گئے جہاں تک علمارِ ہند میں سے کم ہی کسی کی رسائی ہوئی ہو۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ علوم وفنون کے میدان میں وہ اپنے اساتذہ کرام سے بھی آگے نکل گئے۔ علامہ شبلیؒ نے مجلہ "الندوہ" (دسمبر ۱۹۰۵) میں آپ کی تصنیف جمہرۃ البلاغۃ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "ان کی کوئی مثال نہیں۔ ادب میں ان کی نظیر نہیں[۱]"۔ اس بلند مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود انھوں نے اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ انگریزی زبان کو سیکھنے کی طرف توجہ کی اگرچہ اس زمانے میں انگریزی زبان کا پڑھنا مسلمانوں کے نزدیک معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ ۱۸۹۲ء میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی اور علوم عربیہ کے حصول کے بعد علوم جدیدہ سے بہرہ ور ہوئے۔ گو اب ہندوستان میں یہ کوئی عجیب بات نہیں رہی اور بہت سے لوگ یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک بنیادی فرق یہ ملحوظ رہے کہ اکثر و بیشتر لوگ جب جدید تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اپنے پچھلے اکتسابات کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں لیکن علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اپنی پچھلی تعلیمات کو سینے سے لگائے رکھا۔ تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جدید علوم حاصل کرنے والے ایک بڑے طبقے کی عادتیں بدل گئیں اور وہ اسلامی علوم و ثقافت کو حقیر گرداننے لگے اور اپنے سلف صالحین کو کم تر و بے وقعت سمجھنے لگے اور ان کی تہذیب، رسم و رواج اور پوشش کو ناپسند کرنے لگے۔ اس کے برخلاف انھیں علوم نے مولانا فراہیؒ کو

دینی معاملات میں بہت سخت اور ان امور میں متشدد بنا دیا جن میں عقل اور دین کی رو سے تشددہی بہتر ہے چنانچہ وہ تقوی، زہد، علم وفضل اور ان اخلاق حسنہ کے جامع تھے جن سے سلف صالحین متصف تھے۔ عقائد کے باب میں حریت فکر، علوم عصریہ کا گہرا مطالعہ، حالات حاضرہ کی مکمل خبراور مقتضیات زمانہ سے حقیقی واقفیت ایسی خصوصیات ہیں جن میں اپنی مثال وہ آپ تھے۔ علاوہ ازیں وہ اور بھی بہت سی ایسی خوبیوں سے متصف تھے جو اس زمانہ کے روشن خیال علماء کے لیے باعث فخر ہیں۔ اہل مشرق اور اہل مغرب کی اچھی صفات کے اپنانے اور دینی اور انگریزی علوم کے حصول کے باعث ان کی حیثیت ایک ایسے مجمع البحرین کی ہوگئی جہاں دو سمندر آپس میں ملتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک دیوار حائل رہتی ہے اور وہ اپنے حدود سے تجاوز نہیں کرتے۔ یا یوں کہیے کہ ایک ہی افق پر دو چاند لوزافگن ہیں اور ساری دنیا کو اپنی ضیا پاشیوں سے منور کر رہے ہیں۔

زمانہ تعلیم کے بعض علمی کام :

عربی زبان وادب سے فراغت کے بعد مولانا فراہی علی گڑھ تشریف لے گئے۔ ان دنوں کالج کے ہر طالب علم کے لیے عربی و فارسی کی تعلیم لازمی تھی لیکن مولانا کو اس کلیہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اس باب میں سر سید احمد خاں نے کالج کے پرنسپل کو یہ لکھا کہ ان دونوں زبانوں میں مولانا فراہی کی لیاقت اساتذہ سے کم نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سر سید احمد خاں ان دونوں میں ان کی اہلیت ولیاقت کے قائل تھے۔ چنانچہ انھوں نے اسی دوران مولانا فراہیؒ سے علامہ شبلی کی کتاب "تاریخ بدر الاسلام" اور "طبقات ابن سعد" کے ایک جزو کو، جو اس وقت تک چھپی نہیں تھی، کالج کے طلبہ کے لیے فارسی میں منتقل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ترجمہ اتنا معیاری تھا کہ دونوں کتابیں طباعت کے بعد داخل نصاب کر دی گئیں۔ مذکورہ باتوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انھیں ان دونوں زبانوں پر کس قدر قدرت حاصل تھی۔

ملازمتیں :

مختلف تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد وہ متعدد مناصب پر فائز ہوئے۔ سب سے

پہلے ۱۸۹۷ء میں وہ مدرسۃ الاسلام کراچی میں منصب تدریس پر فائز ہوئے اور ۱۹۰۶ء تک وہاں تدریسی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ تصنیفی سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس کے بعد ان کا تقرر علی گڑھ کالج میں عربی کے استاد کی حیثیت سے ہوا اور یہاں اپنے قیام کے دوران جو ۱۹۰۸ء تک رہا فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ تصنیفی مشاغل بھی برابر چلتے رہے۔ اس کے بعد آپ الٰہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے اور ۱۹۱۴ء میں وہیں سے حیدر آباد چلے گئے جہاں انھیں مدرسہ دار العلوم العربیہ الامیریہ'' کا ذمہ دار متعین کیا گیا۔ وہاں آپ کا قیام ۱۹۱۹ء تک رہا۔ اس دوران آپ نے مدرسہ کے حالات و معاملات اور نصاب کے سلسلے میں مفید اور دوررس اصلاحات کیں، وہیں پر آپ نے اپنی تفسیر کے بعض اجزاء کی بھی تالیف کی لیکن جب انھیں یہ احساس ہوا کہ مدرسہ کی ذمہ داریاں قرآن کے مطالعے میں مانع ہو رہی ہیں اور قرآن کے اسرار و رموز پر غور و فکر کے لیے انھیں خاطر خواہ یکسوئی نہیں مل پا رہی ہے تو انھوں نے ترک ملازمت کا فیصلہ کر لیا اور ہر چیز سے مُنہ موڑ کر خود کو صرف قرآن کے لیے یکسو کر لیا۔ امراء اور اعیان سلطنت اور ان کے دوسرے قدر دانوں نے انھیں اس ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں اور وہ وہاں مزید وقت دینے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوئے کیونکہ اس سے کہیں زیادہ اہم کام ان کے پیشِ نظر تھا جو علامہ شبلی کے ذہن میں ایک مدت سے جا گزیں تھا۔ علامہ شبلی کا منصوبہ یہ تھا کہ مولانا فراہی دار المصنفین اور مدرسۃ الاصلاح کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ شبلی نے انھیں ایک خط اس وقت لکھا تھا جب وہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر تھے جس میں انھیں مدرسۃ الاصلاح آنے کی دعوت دی گئی تھی تاکہ دونوں مل کر اس کا نظم و نسق سنبھال لیں[۲۲]۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں انھیں حیدر آباد ایک خط لکھا۔ اس خط میں اپنی گوناگوں بیماریوں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

" دار المصنفین اگر میں نے قائم کر دیا تو تمہارے علاوہ اس کا انتظام و انصرام کون چلا سکتا ہے[۲۳]"

چنانچہ وطن واپسی کے بعد استاذ امام نے ہر چیز سے منہ موڑ کر اپنی ساری توجہ دار المصنفین پر مرکوز کی۔ وہ اس کی مجلسِ انتظامیہ کے صدر اور اس کے بانیوں میں تھے اور یہاں آنے کے بعد تصنیف و تالیف کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیز قرآن پر غور و خوض میں انہماک بڑھ گیا۔ علاوہ ازیں جو

طلبہ آپ کے پاس آتے انھیں درس قرآن دیتے۔ زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں ہیں اس کے بہترین نتائج سامنے آئے جن سے اہلِ علم بخوبی واقف ہیں چنانچہ ان غیر معمولی خدمات کا ذکر کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ان کے اخلاق وعادات اور وضع قطع پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

وضع قطع اور اخلاق :

علامہ تقی الدین ہلالی کے بقول وہ گندمی رنگ کے نہایت وجیہہ اور بلند قامت انسان تھے۔ داڑھی گول، لمبی اور بالکل سفید تھی۔ وہ گوشہ نشین اور خلوت پسند تھے۔ ان کے اندر سطحیت اور ریاکاری کا کوئی شائبہ تک نہ تھا ہر ایک سے تواضع اور خاکساری سے ملتے، زہد وصفات کاملہ اور اخلاق فاضلہ میں اپنی مثال آپ تھے، زیادہ تر خاموش رہتے لیکن بات کرتے تو پر لطف ہوتی بڑے عبادت گزار، گوشہ نشیں اور لذات دنیا سے بہت دور تھے۔ شب بیداری ان کا معمول تھا راتوں کو اٹھ کر تہجد پڑھتے اور قرآن کی تلاوت کرتے، نماز پڑھتے وقت آنکھیں اشکبار ہوتیں۔ نماز اس طرح پڑھتے گویا اللہ تعالیٰ انھیں دیکھ رہا ہے۔ وہ علمار متقدمین کے اخلاق کے پرتو تھے اور ان کے اندر اولیار اللہ کی صفات نمایاں تھیں۔ انھیں دیکھ کر علمار متقدمین کے فضل وکمال کا اندازہ کیا جاسکتا تھا اور ان کے اندر اولیار اللہ کی خوشبو محسوس کی جاسکتی تھی، اگرچہ انھوں نے انگریزی اور علوم جدیدہ سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا۔ زیادہ تر اپنے کام خود کرتے، صرف مجبوری کی حالت میں کسی کو زحمت دیتے۔ ان کی چھوٹی یا بڑی کوئی ضرورت کوئی انجام دینا چاہتا تو اسے بڑی خوش اسلوبی سے منع کردیتے، ان کی شخصیت میں ایک عجیب جاذبیت تھی جو خال خال ہی کسی میں نظر آتی ہے۔ فراخی اور خوشحالی کے باوجود رہن سہن، لباس اور غذا وغیرہ کے معاملے میں بالکل سادہ مزاج تھے۔ اپنے علم وفضل کے خزانے پر انھیں ذرہ برابر کبر وغرہ نہ تھا جیسے وہ اس سے واقف ہی نہ ہوں۔ انھوں نے کبھی کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ صاحبِ ثروت یا بہت بڑے عالم ہیں۔ ایک عام آدمی ان کو دیکھ کر ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں کرپاتا۔ صرف ان سے تعلق رکھنے والا ہی انھیں ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا۔ چنانچہ ایک بار مجھے بھی ایسا ہی دھوکہ ہوا۔ جب میں بغرض تعلیم مدرسۃ الاصلاح گیا اور وہاں درجہ مرلیاوں میں داخلہ لیا تو دیگر اساتذہ کے ساتھ وہاں انھیں بھی دیکھا۔ وہ بالعموم

وہاں تین دن قیام فرماتے تھے۔ میں ان کی اصلی حیثیت کا ادراک نہ کرسکا اور اساتذہ کے درمیان انھیں اٹھتے بیٹھتے دیکھ کر انھیں بھی ایک عام اُستاذ سمجھا۔ اصل حقیقت کا اندازہ تو مجھے کچھ دنوں بعد ہوا تب ان کے بلند مقام اور عالی مرتبہ کا احساس ہوا۔ وہ قناعت پسند، جاہ و منصب سے بے پروا اور قیادت و سیاست سے کوسوں دور رہتے تھے۔ ان کے مزاج میں استغنا تھا حالانکہ انھیں ایسے مواقع ملے تھے جن سے وہ شہرت و عزت کی چوٹی تک پہنچ سکتے تھے اور بہت سے دنیوی فوائد بآسانی حاصل کرسکتے تھے لیکن انھیں ان چیزوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہ ہوئی چنانچہ جب ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے حکومت برطانیہ اور عرب شیوخ کے درمیان اختلافات کو ختم کرانے کے لیے سواحل عرب اور خلیج فارس کا دورہ کیا تو اس سفر میں بحیثیت ترجمان مولانا کا انتخاب ہوا۔ عرب شیوخ کے سامنے عربی میں جو خطبہ پڑھا گیا اسے مولانا ہی نے تیار کیا تھا۔ اگر انھیں شہرت و عزت یا کسی اہم سرکاری منصب کی خواہش ہوتی تو اسے وائسرائے کے ذریعے بآسانی حاصل کرسکتے تھے۔ لیکن ان کے دل میں اس طرح کا کوئی خیال نہیں آیا۔ انھوں نے اپنے اس سفر سے متعلق کچھ اشعار کہے تھے جسے سید سلیمان ندوی نے ان کی وفات کے بعد مجلہ "معارف" میں شائع کیا تھا۔ ان اشعار سے واضح ہے کہ وہ مال و دولت اور شہرت و عزت کی خواہش سے ہمیشہ دور رہے۔ اشعار درج ذیل ہیں:

نادان در جستجوئے کام افتادہ است ۔۔۔ دانا در جستجوئے نام افتادہ است

بگریز فراہیا! ازیں ہر دو کہ زود ۔۔۔ بینی کہ گلوئے شان بدام افتادہ است

نادان تلاش رزق میں سرگرداں ہے اور دانا نام و شہرت کی جستجو میں

فراہی! ان دونوں ہی سے بچو کیونکہ جلد ہی نظر آئے گا کہ دونوں کی گردنیں زیر دام ہیں۔

گویند کہ گمنام بدن از خامی است ۔۔۔ آوارۂ و نام جو کہ خوش فرجامی است

در پیش فراہی اے نکو اندیشاں ۔۔۔ ایں جستن نام بدترین بد نامی است

کہتے ہیں کہ گمنامی بہت بڑی کمی ہے۔ نام و نمود کی جستجو کرو کہ یہی دلیل خوش بختی ہے۔

لیکن اے نیک اندیش لوگو فراہی کے نزدیک۔ نام و نمود کی طلب ہی بدترین بدنامی کی چیز ہے۔

خاک ہے گر جہاں میں کچھ ہے ہے   وہم ہے گر گماں میں کچھ ہے ہے
تجھ پر کیا اعتبار ہے ہستی   آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے ہے

مندرجہ بالا اشعار اس بات پر شاہد ہیں کہ نام ونمود اور جاہ ومنصب سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی چاہے اسے کتنی ہی آسانی سے حاصل کیا جاسکتا ہو۔ گو اس طرح کے واقعات بہت ہیں لیکن ان کے مزاج کو سمجھنے کے لیے یہی ایک واقعہ کافی ہے۔ مولانا کی شخصیت کا اندازہ کسی قدر اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ہزار مشاہرہ کے منصب جلیل سے بلا کسی سبب مستعفی ہو گئے جس کی بڑے بڑے لوگ تمنا کرتے ہیں۔ ایسا وہ صرف اس وجہ سے کرسکے کہ وہ تھوڑے پر قناعت کے خوگر تھے اور زیادہ کی ہوس نہیں کرتے تھے انھوں نے ہمیشہ عزت اور گوشہ نشینی کو ترجیح دی لیکن کہیں سورج کو دن میں بھی چھپایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے اہل علم اور وہ حضرات جن کو ان کی کتابوں اور ان کی تفسیر نظام القرآن کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے یا جنھیں ان سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا ہے سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مولانا حمید الدین فراہی مختلف علوم خصوصاً علوم قرآن میں یگانہ روزگار تھے۔ کوئی ان کی گرد کو بھی نہ پاسکا۔ اسی طرح ان کے علم وفضل کی شہرت دور دراز ممالک مثلاً مصر، شام، حجاز نیز دوسرے اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔ چنانچہ مشہور مجلہ "المنار" کے بانی سید رشید رضا مصری نے ان کی کتابوں پر ایک تبصرہ لکھا جس میں ان کی کتابوں اور ان کی شخصیت کی تعریف واعتراف میں رطب اللسان ہیں۔ اسی دار العلوم ندوۃ العلماء میں عربی ادب کے استاذ علامہ تقی الدین ہلالی صاحب ۱۳۴۲ھ میں ہندوستان آئے تو انھوں نے مولانا فراہی سے ملاقات کے لیے ان کے گاؤں کا سفر کیا۔ اس کے علاوہ شام، مصر، حجاز کے دوسرے بہت سے جلیل القدر علماء نے بھی ان سے ملاقاتیں کیں۔ ایک دفعہ میں اپنے استاذ علامہ تقی الدین ہلالی کی ڈائری کے صفحات الٹ پلٹ رہا تھا جس میں انھوں نے اپنے سفر ہندوستان کی روداد قلم بند کی تھی۔ ایک جگہ میری نظر علامہ فراہی کی تحریر پر پڑی جسے میں نے فوراً پہچان لیا۔ اس میں انھوں نے بہت اختصار سے اپنی تاریخ ولادت، تعلیم کی ابتدا اور مختلف عہدوں پر تقرر کا ذکر کیا تھا۔ اسے اس مضمون کے آخر میں بعینہٖ نقل کروں گا۔ اسی ڈائری میں ایک دوسری جگہ علامہ نے مولانا کے عادات واطوار کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں جسے میں نے تمام وکمال نقل کردیا ہے۔

مولانا فراہی کا ایک دیوان بھی ہے۔ مجھے خود ان سے اس کے اشعار سننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے اشعار بہت بلیغ اور اثر آفریں ہیں جو مسلمانوں کے پژمردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس میں اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں، جنگ طرابلس اور جنگ عظیم کا پرسوز انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی گفتگو کی فصاحت کا یہ عالم تھا کہ علماء ہند تو کیا علماء عرب بھی ان کے سامنے ماند پڑ جائیں۔ ان کی عمر لگ بھگ ۰۷ سال تھی جب انھوں نے مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد رکھی جس میں قرآن کی تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جو دراصل مسلمانوں کی متاع گم شدہ ہے۔ قرآن کی تفسیر سے متعلق مجھے ان سے ایک تقریر سننے کا موقع ملا جس کی فصاحت و بلاغت اور اثر انگیزی سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ وہ مسئلہ خلافت سے بخوبی واقف تھے۔ اہل ہند کے برخلاف خلافت سے متعلق ان کے یہاں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا۔ عقائد اور دوسرے شرعی معاملات میں وہ کسی خاص مسلک کے پیرو نہ تھے بلکہ اس بارے میں خود اجتہاد کرتے تھے۔ البتہ عبادات میں حنفی مسلک کی پیروی کرتے تھے اور ایسا غالباً اس لیے تھا کہ اسی ماحول میں ان کی نشو و نما ہوئی تھی۔ معاملات میں وہ حنفی مسلک کو آسان تصور کرتے تھے۔ انگریزی، عربی، فارسی اور اردو چاروں زبانوں کے ماہر تھے مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ علی گڑھ میں بھی ایک ممتاز استاذ کی حیثیت سے کام کیا اور آج (۱۷ر رمضان ۱۳۴۲ھ) تک میری جن علماء سے ملاقات ہوئی وہ ان سب پر فوقیت رکھتے تھے۔

علمی خدمات:

علامہ فراہیؒ کی علمی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس کی بھرپور توضیح و تشریح کے لیے ایک ادارہ کی ضرورت ہے تاہم یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کی جدید طرز اور منفرد اسلوب کی تفسیر قرآن پر کسی قدر روشنی ڈالی جائے جس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ انہوں نے اس کام میں اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا اور لگ بھگ تیس سال کا عرصہ مطالعۂ قرآن کے لیے وقف کر دیا۔ جس کے نتیجے میں قرآن کی حکمتوں اور اسرار و رموز تک ان کی رسائی ہوئی۔ ان کی یہ عظیم خدمات نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری امت مسلمہ کے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ علامہؒ کا خیال تھا کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے

کی جائے اس لیے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تشریح کرتا ہے۔ اکثر مفسرین کے برعکس ان کا یہ نظریہ تھا کہ قرآن کی تمام آیات منظم اور پورا قرآن باہم مربوط ہے۔ علامہ کے خیال کے مطابق اگر کسی آیت یا سورۃ کو اس کی اصلی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو نظم قرآن درہم برہم ہو جائے گا۔ کلام کا سارا حسن، بلاغت اور حکمت جاتی رہے گی۔ اپنے ان خیالات کی تائید میں انہوں نے ٹھوس اور مضبوط دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ نیز اپنے ہی اصولوں کی روشنی میں تفسیر نظام القرآن، تالیف کی جو ہنوز طبع نہیں ہو سکی ہے۔ نظم قرآن کے اثبات کے لیے انھوں نے جو دلیلیں دی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر آیتوں اور سورتوں میں کوئی خاص نظم نہ ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم کیوں دیتے کہ فلاں آیت کو فلاں سورۃ میں اور فلاں آیت کو فلاں سورۃ میں رکھا جائے۔ اور اس کا مطلب کیا ہوتا۔ صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بیک وقت متعدد سورتیں نازل ہوتی تھیں اور جب آپ پر کوئی آیت یا چند آیات نازل ہوتیں تو آپ کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر فرماتے کہ ان آیتوں کو فلاں سورۃ میں رکھو جس میں یہ یہ باتیں بیان ہوئی ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ استاذ امام فہم قرآن اور اس کی مشکلات کی عقدہ کشائی کے سلسلہ میں اللہ کی آیتوں میں سے ایک آیت تھے۔ ان کی تفسیر نظام القرآن کے کچھ اجزاء کی اشاعت ہو چکی ہے۔ لیکن بیشتر حصے ابھی غیر مطبوعہ ہیں ان کی ایک گرانقدر تصنیف الرای الصحیح فی من ھوالذبیح ہے۔ اس میں مولاناؒ نے تورات اور قرآن سے استدلال کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ ذبیح اللہ اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ اس طرح یہود نے تورات میں جو تحریفات کی ہیں ان کی پردہ کشائی کی ہے۔ اس اہم مسئلہ کی تحقیق انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کے لیے کی تھی جب وہ اپنی شہرہ آفاق کتاب سیرۃ النبی، تصنیف کر رہے تھے۔ استاذ امام نے اس ضرورت کے پوری ہو جانے کے بعد مزید غور و خوض کیا اور کچھ اضافے کے بعد کتابی شکل میں شائع کیا انہیں تصنیفات میں "امعان فی اقسام القرآن" بھی شامل ہے جس میں مولانا نے قرآن مجید میں استعمال ہوئے کلمات قسم سے بحث کی ہے۔ اس تحقیق سے ان تمام شکوک و شبہات کا مکمل طور پر ازالہ ہوتا ہے جو آیات قسم کی تلاوت کے دوران ذہن میں خلجان کے باعث ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان سے پہلے بھی یہ موضوع زیر بحث آچکا ہے اور امام رازی نے اپنی تفسیر میں اس کے معنی و مفہوم کی پردہ کشائی کی کوشش کی اور امام ابن القیم نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب "التبیان فی اقسام القرآن"

بھی تصنیف کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس نے "الامعان" کا بغور مطالعہ کیا ہے اور امام رازی اور ابن القیم کی تحقیقات سے بھی رجوع کیا ہے وہ اس بات کی گواہی دے گا کہ یہ علوم قرآن اور احکام شریعت کے یہ دونوں ماہرین اس باب میں خود ہی ایسی الجھنوں کے شکار ہو گئے جن سے گلو خلاصی ممکن نہ ہو سکی۔ مولانا فراہی نے اقسام القرآن کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کو اس طرح حل کر دیا کہ صورتِ حال بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی۔ میرے اس بیان پر جسے بھی کچھ شبہ ہو اُسے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی اہم ترین کتابوں میں ایک کتاب "جمہرۃ البلاغۃ" ہے جس میں قرآنی بلاغت اور نظم آیات کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ نیز ارسطو کے نظریہ بلاغت پر تنقید کی گئی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے مجلہ "الندوہ" (دسمبر ۱۹۰۵ء) میں اس پر تقریظ لکھی جس میں اس کی بہت کچھ توصیف کی اور کہا کہ مسلمانوں کے لیے اس کتاب کی وہی اہمیت ہے جو پیاسے کے لیے آبِ زلال کی ہوتی ہے۔

ان کا ایک کارنامہ مدرسۃ الاصلاح ہے۔ یہ ایک عربی دینی درسگاہ ہے جو اپنی کچھ مخصوص خوبیوں کی وجہ سے ہندوستان کے دیگر دینی مدارس سے ممتاز ہے۔ مولانا آخر دم تک اس کے ناظم رہے۔ وہ ہفتہ میں تین شب و روز مدرسہ پر قیام کرتے۔ اساتذہ اور منتہی طالب علموں کو درس قرآن دیتے۔ عربی درسیات کی نگرانی کرتے اور مدارس میں رائج نصاب پر برابر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ ان کی نظر میں یہ نصاب از کار رفتہ اور غیر سود مند تھا۔ انھوں نے اس میں مفید اصلاحات کیں اور غیر مفید علوم کو نکال کر اسے مختصر کیا۔ اس طرح اس مدرسہ کا نہایت عمدہ نصاب تعلیم تیار ہو گیا۔ میری خواہش تھی کہ اس نصاب سے متعلق مولانا کے اِن خیالات کو جن کا انعکاس اس نصاب میں پایا جاتا ہے نیز اس مدرسہ اور اس کے اساتذہ کی بعض خصوصیات اور اپنے بعض اہم اساتذہ کا ذکر اس مضمون میں کروں لیکن رسالہ کی تنگ دامانی نے دامن تھام لیا۔ انشاء اللہ بعد میں اس کا مفصل ذکر کیا جائے گا اور اس مضمون کو میں انہی کی اس تحریر پر ختم کر رہا ہوں جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں کہ "میں جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ کو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں پھریہا میں پیدا ہوا اور لگ بھگ دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اور نو مہینے کی مدت میں فارسی زبان سیکھ لی۔ لیکن مختلف بیماریوں کے باعث اس میں لکھنے پڑھنے کا کام دو سال تک رکا رہا۔ پھر چودہ سال کی عمر میں عربی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔

درسِ نظامی کی اکثر کتابیں میں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی علامہ شبلیؒ سے پڑھیں۔ پھر ہندستان کے بعض مشاہیر اہل علم جیسے لکھنؤ میں مولانا عبد الحیؒ فرنگی محلی اور لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ پھر خرابی صحت کے باعث ایک سال تک تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس کے بعد انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ پھر وکالت کے پیشہ سے نفرت کے باوجود دو سال تک موجودہ قوانین کی تعلیم حاصل کی لیکن پھر اسے چھوڑ دیا۔ بالآخر میں نے اپنے لیے معلمی کا پیشہ پسند کیا اور مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ چنانچہ علی گڑھ کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر رہا اور دار العلوم حیدر آباد میں پرنسپل کے فرائض انجام دیئے۔ چوں کہ قرآن کے علاوہ مجھے کسی اور کتاب سے دلچسپی نہیں سوائے متون حدیث اور ان چیزوں کے جو فہم قرآن میں مددگار ہوں اور چونکہ یہ مشاغل مطالعہ قرآن میں حارج ہوتے تھے اس لیے میں نے ملازمت کو خیر آباد کہا اور اپنے وطن لوٹ آیا۔ اس وقت میری عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی۔ افسوس کہ عمر کے اس حصے پر جو ایسی مصروفیات میں ضائع ہوئی جن کا نقصان فائدے سے کہیں زیادہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان پر خاتمہ کی توفیق دے۔ آمین

ماخوذ از مجلہ الضیاء الشہریہ، لکھنؤ

شعبان ۱۳۵۲/ نومبر ۱۹۳۳ء

حواشی

۱ مولانا فراہی کا فارسی دیوان دوبارہ کافی اضافہ کے ساتھ ۱۹۶۷ء میں دائرہ حمیدیہ (سرائے میر) کے زیر اہتمام "نوائے پہلوی" (مرتبہ مولانا بدر الدین اصلاحی) کے نام سے شائع ہوا ہے (ادارہ)

۲ مکاتیب شبلی، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۲۷ء، ۲/ ۳۳

۳ حوالہ مذکور، ۲/ ۵۲

۴ مولانا فراہی کی عربی تفسیر نظام القرآن کے متعدد اجزاء اور ان کے اردو تراجم شائع ہو چکے ہیں ان کی اشاعت سے متعلق تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں "کتابیات فراہی" (مرتبہ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی) ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء، ص ۲۳-۲۰ (ادارہ)

۵ مقالات شبلی، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۳۱ء، ۲/ ۱۲